۱۹۷۰ء

کی منتخب شاعری

(نظمیں، غزلیں)

مرتبین

کمار پاشی — پریم گوپال متّل

۱۹۷۰
کی
منتخب شاعری
مرتبین
کمار پاشی ـ پریم گوپال متل

923115550821

نبیل حسین نبیل
اسلام آباد

سیڑھیاں چڑھتے اچانک وہ ملی تھی مجھ کو
اس کی آواز میں موجود تھی حیرت اس کی

شہزاد احمد

۱۹۷۰ء کی منتخب شاعری

نبیل
۲۰ مئی ۲۰۲۰ء۔ اسلام آباد

۱۹۷۰ء

کی منتخب شاعری

ترتیب:

کمار پاشی

پریم گوپال متل

ناشر

پی۔ کے۔ پبلیکیشنز، ۱۷۱۵، آریہ سماج روڈ، قرول باغ، نئی دہلی ۵

بارِ اوّل : جنوری ۱۹۷۱ء

زیرِ اہتمام : کے۔ جی۔ مِتّل

مطبع : یونین پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

قیمت : تین روپے

نظمیں

ن.م. راشد

مجید امجد

شیب الرحمٰن

وزیر آغا

باقر مہدی

کرشن موہن

سلیمان اریب

بلراج کومل

مخمور سعیدی

قاضی سلیم

بشر نواز

ندا فاضلی

عمیق حنفی

شہریار

جیلانی کامران

عادل منصوری

صادق

نثار ناسک

ظہیر صدیقی

کرشن مراری

زاہدہ زیدی

حمید سہروردی

حمیدہ فاروق

مصحف اقبال توصیفی

سرور کامران

سید حبیب

وہاب دانش

عباس اطہر

کمار پاشی

غزلیں

احمد ندیم قاسمی

گوپال متل

خورشید احمد جامی — مظہر امام

بل کرشن اشک — ممتاز راشد

شہزاد احمد — مسعود سبزواری — غلام مرتضیٰ راہی

شاذ تمکنت — سلطان اختر — رحمت الاختر

حسن نعیم — ناصر شہزاد — چندر پرکاش شاد

بشیر بدر — کرامت علی کرامت — اسلم آزاد

محمد علوی — پرکاش فکری — احتشام اختر

خلیل الرحمن اعظمی — نازش انصاری — زیب غوری

من موہن تلخ — شمیم حنفی — عقیل شاداب

بانی — آزاد گلاٹی — حسن کمال

زبیر رضوی — قمر اقبال — عبدالرحیم نشتر

نشتر خانقاہی — عروج زیدی — شاہد ماہلی

راج نرائن راز — ارشد بجنوری — احمد ہمیش

باتیں

یہ چوتھا اور اس دہائی کا آخری سالانہ شعری انتخاب ہے۔ اس دہائی میں ایوانِ شعر میں جو مختلف اور منفرد آوازیں سنائی دی ہیں، ان سے ایک ایسی خوشگوار فضا تخلیق ہوئی ہے جس سے مستقبل کی اردو شاعری کی سمت و رفتار کا تعین کرنا قدرے آسان ہوگیا ہے۔

بیانیہ طرزِ اظہار سے دور، سرگوشی یا خود کلامی کے سے لہجے والی، معنویت کے اعتبار سے زیادہ گہری اور وسیع، داخلی اور کسی حد تک نجی تجربات و مسائل سے رنگی اور مروجہ شعری تلازمات کے حصار سے آزاد یہ شاعری ایک نئے شعری و فنی ضابطے کی تشکیل کا احساس کراتی ہے۔ یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ یہ شاعری ہمارے پرانے شعری سرمایے کی نفی نہیں کرتی بلکہ نئی فضا میں اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہے۔

بعض ناقدوں نے اس دہائی کی اردو شاعری کے گرد مایوسی، مرگ پرستی اور تنہائی جیسے موضوعات کا حصار کھینچنے کی جو کوشش کی ہے اور جس کے نتیجے میں جدید شاعری پر وقتاً فوقتاً عجیب و غریب الزامات عاید ہوتے رہے ہیں، پچھلے انتخابات کی طرح زیرِ نظر شعری انتخاب بھی اس کی نفی کے لیے کافی ہے۔ اس انتخاب میں آپ کو اس دہائی کی شاعری کے وہ تمام خوشگوار رنگ نظر آئیں گے جو اپنی انفرادی پہچان رکھتے ہیں اور جنھیں کسی یک رنگی نظریاتی حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

دہلی۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء

(مرتبین)

ہم ان شاعروں کا جن کی تخلیقات اس مجموعے
میں شامل ہیں اور ان تمام مدیران کا جن کے
رسائل سے یہ تخلیقات نقل کی گئی ہیں، تہ دل
سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نظمیں

اے غزالِ شب
تری پیاس کیسے بجھاؤں میں
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو مری جاں میں ہے
وہ سراب ساحرِ خوف ہے
جو سحر سے شام کے رہ گزر
میں فریبِ راہروِ سادہ ہے
وہ سراب زادہ، سراب گر، کہ ہزار صورتِ نو بہ نو
میں قدم قدم پہ ستادہ ہے
وہ جو غالب و ہمہ گیر دشتِ گماں میں ہے
مرے دل میں جیسے یقین بن کے سما گیا
مرے ہست و بود پہ چھا گیا

اے غزالِ شب
اسی فتنہ کار سے چھپ گئے
مرے دیر و زود بھی خواب میں

مرے نزد و دور حجاب میں
وہ حجاب کیسے اٹھاؤں میں جو کشیدہ قالبِ دل میں ہے
کہ میں دیکھ پاؤں درونِ جاں
جہاں خوف و غم کا نشاں نہیں
جہاں یہ سرابِ رواں نہیں
اے غزالِ شب !

——— سطور (دہلی)

مجید امجد

غریب

ننھی، بھولی، میلے میلے گالوں والی، بے سدھ سی اک بچی
تیری جانب دیکھ رہی ہے، دیکھ اس کی آنکھیں تیری توجہ کی پیاسی ہیں

اس کی نازک بے حس ٹھوڑی کو اپنی انگلی کی سنہری پور سے مس تو کر، — اور
اس سے اتنا تو پوچھ "اچھی بلّو، تو کیوں چپ ہے"
اور جب وہ منہ پھیر کے اپنی آنکھیں اپنے ہی چہرے پہ جھکا لے۔
تو ہی بڑھ کر اس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ ہاں، ایسے ہی!

کیوں — اس جھنجھلو نے تجھ سے کہا کیا۔
یہ کیا — تیری آنکھیں بھیگ گئیں کیوں۔
اس نے تجھ سے کہا کیا، ساتوں آسمانوں کے مالک،
اتنے پتلے دل والے مالک، — ہم بھی روز اس چہرے کی کتھا سنتے ہیں
ہم تو کڑا کر لیتے ہیں جی، ایسے موقعوں پر....

— کتاب (لکھنؤ)

منیب الرحمن

اجنتا

چٹانیں بول سکتی ہیں
چٹانیں راز اپنے کھول سکتی ہیں
دکھا سکتی ہیں یہ تقدیس کی دنیائے ناپیدا
جہاں فکر و فن و عزلت نشیں کی خانقاہیں ہیں
جہاں احساس کی گہری گپھائیں ہیں

وہ کس کی انگلیاں تھیں جن کے لمس سحر آگیں نے
انھیں اذنِ سخن بخشا
وہ کس کی گرمیِ دل تھی کہ جس نے ان کو تن بخشا
یہاں ہر شخص آئے گا
مگر اس کو نہ پائے گا
اسے ڈھونڈو وہ شاید ان چٹانوں میں چھپا ہوگا
یہ پہلی شرط تھی ان کے تکلم کی
کہ جو بھی ان کے اسرارِ مقفل ڈھونڈنے آئے
وہ خود ان میں سما جائے

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

Scanned with CamScanner

وزیر آغا

ڈھلوان

ایک ننگی چیختی آواز
پھر چابک کا شور
کھڑکھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیوں کی صدا
اور میں آواز کے آگے جُتا!
میری آنکھوں پر نقاب
میرے منہ میں خاردار آہن کی جیب
میرے بازو
سخت چمڑے کے سیہ رسّوں کے
برہم جال میں جکڑے ہوئے
اور میرے سُم
میرے چاروں رفیق
گھاٹیوں سے، پتھروں سے بے خطر
خندقوں سے بے نیاز!

آہنگ (گیا)

باقر مہدی

ایک لمبی گونج

پورب دیس سے پھر اٹھی
چیخ کی لمبی گونج

قطرے بن کر برس پڑے
ٹوٹے ٹوٹے، بسمل لفظ

کانوں میں نقارے باجے
رگ رگ میں چنگاری دوڑی

دبی دبی ساری آہیں
ٹھنڈے سینوں میں ابھریں
سوکھے ہونٹوں سے نکلیں
بجھی بجھی سی آنکھوں میں
دیکھو! امنگوں کی بجلی
تڑپ تڑپ کے چمکے بجلی!
لہر لہر ٹکرائے
طوفانوں کو جگائے

سنو سنو!!
اُس پار افق کے
چیخ کی لمبی گونج!

——— سطور (دہلی)

آوارہ ـــــ سڑکوں پر گھومیں
بیٹنگ اور بیٹل اور ہپی
"تحریکِ نگل" ـــــ کھل جا اور کھل
چھک نشا اور اڑ جا ٹبیٹل
سرگوشی کر، بہہ جا قلقل

جوبن کی ندی پہ بنالے بنجارہ رنگت کی دکھ سکھ سنگت کا پل
جسم ہے جام نل، روح و دل کھول کے اس میں گھول، اس میں گھل
جیون ہے چھل تو بھی جیون کو دے جا چھل
ناچیں، گائیں، بہکیں، جھومیں
جب جی چاہے ہم بستر ہوں
جب جی چاہے، چاٹیں چومیں
مچلیں اور مچائیں دھومیں
بھول ببول کہ دھول نہیں ہم
جنم مرن کی شہراہوں پر غول نہیں ہم
ہاتھ میں لے ترشول ہیش نہیں، درویش نہیں کہ رسول نہیں ہم

روز و شب نشے میں جھولیں
مستی کا ہر رنگ قبولیں
اپنی پچھلی نسل کی آزادی پر پھولیں
دھرتی کے ہر سنجیدہ اقدام کو بھولیں
"کام" رچائیں، کام کو بھولیں

... ...

ڈھیلی چولیں
پھر بھی دل میں حسرت ہے، مریخ کو چھو لیں

—— تحریک (دہلی)

سلیمان اریب

میرا کمرہ

یہ غالب ہیں
یہ ہیں اقبال
یہ بدھا
یہ عیسیٰ ہیں
یہ کیلنڈر میں بیٹھی
ایک ہندستانی دوشیزہ ہے
جس کی نیم عریاں چھاتیاں
ہیں ماہتاب واژگوں گویا
نگران پانچ چہروں، پیکروں نے کیا بنا ڈالا ہے
میرے سادہ کمرے کو
ایک ایسی پینٹنگ جس میں
خدا ترغیبِ جنسی دے رہا ہو
جیسے خود اپنے ہی بندوں کو

——— سطور (دہلی)

بلراج کومل

زرد لڑکی کا چہرہ

منجمد خون جب سُرخ سے کل سیہ ہو گیا
خاک پا واقعہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ فرشتوں نے دیکھا تھا
رنگوں کی ترتیب میں
جانے پہچانے چہروں سے میری ملاقات جب اجنبی سی لگی
آئنہ دیکھنے کے لیے میں اٹھا، آئنہ ہو گیا
تیرگی سے گذرتی ہوئی روشنی برگِ اسرار تھی
آنکھ کے سامنے روشنی خون تھی
خون پہلے گرا، منجمد ہو گیا، پھر سیہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ
گذرتا ہوا برگِ اسرار تھا
رہ گزر سے لپک کر مکاں میں گیا
پھر دریچے میں اُبھرا
فرشتوں نے دیکھا تھا
میں نے بھی دیکھا تھا
میں بھی فرشتہ تھا؟

کل کے فسانے کی ترتیب میں لفظ مجھ سے جدا تھے
مگر آج میرے ہیں، کیوں آج بھی اجنبی ہو گئے، ان کو کیا ہو گیا؟
ان کو کیا ہو گیا!؟

منجمد خون پہلے سیہ ہو گیا
پھر فقط واقعہ تھا،
مگر زرد لڑکی کا چہرہ عجب نقش تھا
میں مٹاتا تھا لیکن وہ مٹتا نہ تھا
دید کا حادثہ پہلے منظر بنا
پھر فقط ایک منظر سے بیکار سا سلسلہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ خلا سے بڑا خواب تھا۔

——— سطور (دہلی)

مخمور سعیدی

وہ شہراب بھی اسی جگہ ہے

وہ شہراب بھی اسی جگہ ہے
وہ سرد ریتیلے راستے —
آج بھی انہی وادیوں کی جانب رواں دواں ہیں
جہاں گھنے جھنڈ ہیں درختوں کے،
شاخساروں میں چھپاتے ہوئے پرندوں کی ٹولیاں ہیں
جہاں پہاڑوں کی سرمئی چوٹیوں پہ آوارہ بادلوں نے
نشیمن اپنے بنا رکھے ہیں
ندی کے پانی میں —
سبز پرچھائیوں کی پریوں کا ہے بسیرا
خنک جھونکے ہوا کے جن کا سجل بدن گدگدا رہے ہیں
فضا میں وہ تازگی و تابندگی جہاں مسکرا رہی ہے
ہُوا ہو صدیوں کے بعد جیسے زمیں پہ پہلے پہل سویرا
کیا ہو سورج نے جیسے صدیوں کے بعد اس خاکداں کا پھیرا

وہ شہراب بھی اسی جگہ ہے
وہ سارے منظر ابھی انہی چوکھٹوں میں جیسے جڑے ہوئے ہیں

گئے زمانے بھی جیسے آنکھوں کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں
وہی گلابی سی دھوپ دیوار و در کو رنگیں بنا رہی ہے
کھلی چھتوں پر....

وہی روپہلی سی چاندنی گیت گا رہی ہے
کشادہ دل آنگنوں میں اب بھی
نشاطِ احساس کے شگوفے چٹک رہے ہیں
کہیں سجی ہے خود اپنے ہی سائباں کے نیچے
قرارِ قلب و نظر کی محفل
کہیں پڑوسی کے گھر کا نغمہ — سکوں کی سوغات بانٹتا ہے
کہیں جھروکوں سے جھانکتا ہے کسی کا پندارِ خود نمائی
کہیں منڈیریں پھلانگتا ہے کسی کا احساسِ نارسائی
وہی جھروکے، وہی منڈیریں، بلند و بالا وہی منارے
اور ان مناروں پہ پَر سکھاتے
کبوترانِ حرم وہی ہیں
اذاں کی آواز سن کے مسجد کی سمت اٹھتے قدم وہی ہیں
ابھی وہی آسمان ان کی زمیں پہ سایہ کیئے ہوئے ہے
ابھی وہاں اپنے نیک بندوں کی قسمتوں کی
خدا ضمانت لیے ہوئے ہے

وہ ٹھہراب بھی اسی جگہ ہے
وہ لوگ اب بھی اسی طرح ___
ایک دوسرے کے غموں سے واقف ___ مسرتوں سے بھی باخبر ہیں
وہ آشنا منزلوں کے راہی ہیں ___
جادۂ روز و شب پہ صدیوں سے ہمسفر ہیں
وہ جانتے ہیں
کہ اس شب و روز کی مسافت کا مدعا کیا مآل کیا ہے
وہ جانتے ہیں
کہ کون کس مرحلے پہ کیا سوچتا ہے،
کس کا خیال کیا ہے!
وہ خود کو پہچانتے ہیں،
اپنی حدوں کو بھی جانتے ہیں،
اپنی حدوں میں رہ کر ہی جی رہے ہیں
جنم جنم سے سکھی رہے ہیں

کبھی وہ مجھ سے بھی آشنا تھے، مجھے بھی پہچانتے تھے لیکن
میں ایک لمبے سفر پہ نکلا ....
(دہکتی لوہے کی پٹریاں میرے آگے پیچھے رہیں لپکتی بہت دنوں تک)
اور آج برسوں کے بعد لوٹا تو میں نے دیکھا

میں وہ نہیں ہوں
جسے وہ سب الوداع کہتے ہوئے کسی روز رو پڑے تھے
میں وہ نہیں ہوں
جو اُن سے رخصت کے وقت شاید اداس بھی تھا ملول بھی تھا
میں ان سے کہتا ہوں: میں وہی ہوں
تو میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگتی ہے،
جیسے کہتا ہو کوئی: تم جھوٹ بولتے ہو
(تو کیا یہ سچ ہے کہ دوزخی مجھ میں آگئی ہے ؟!)

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے
وہ سرد رتیلے راستے —
آج بھی انہی وادیوں کی جانب رواں دواں ہیں
وہ سارے منظر ابھی انہی چوکھٹوں میں جیسے جڑے ہوئے ہیں
وہ لوگ اب بھی اسی طرح —
ایک دوسرے کے غموں سے واقف،
مسرّتوں سے بھی باخبر ہیں
مگر اب ان میں مجھے کوئی جانتا نہیں ہے
میں دُور کا، اجنبی مسافر نہیں، کوئی مانتا نہیں ہے

——— ایشیا (دہلی)

قاضی سلیم

کہو ـــــ کچھ تو کہو
(نذرِ گجرات)

کہو شاید ہمارے گوشت کے اندر
لہو کے بربتوں میں
اور دھڑکتی دھمنیوں میں
ـــــ آنکھ بن کر اب بھی کوئی جاگتا ہے
وہی سچائیوں کی قبر کا آسیب
اندھے آئینوں کے عکس کا کوندا
وہ ہمیشہ کے سمندر، کا بلاوا
موت کی سانسوں کا لہرا
بھیک کا کاسہ
کچھ ایسا جس کی شاید اک جھپٹون سے
ہماری خودکشی قربانیوں کا نام پاتی ہے

کہو ـــــ جو کچھ بھی ہے
ـــــ جیسا بھی ہے
وہ آج زندہ ہے
کہو ـــــ کچھ تو کہو وہ جھوٹ ہی پھر آج دہراؤ۔

ـــــ شعر و حکمت (حیدرآباد)

بشر نواز

آنے والے مصنفین کے نام

ایک رقعہ لکھیں
اور یوں لکھیں
ہم تو اپنے دور کی بے رنگیوں، بدعہدیوں اور نفرتوں کی
مردہ تفصیلات کی زندہ کہانی اپنے خوں سے لکھ گئے
ہم کیا کریں / گر اپنا خوں
کالے بدبودار قاتل زہر ہی کی لہر تھا
اور یہ لکھیں / ہمارے دور میں
سات رنگوں کی دھنک
کالے کمبل اور مٹی بھی
اُجلے اُجلے چادروں میں سنگ ریزوں کی بڑی بہتات تھی
اور ہمارے پیرہن / آگ سے کترے گئے تھے
اور جو تھا کھال کے اندر پگھل کر بہہ گیا تھا۔
اور لکھیں یہ بھی، کہ ہم تو اپنا حصّہ پا چکے
اب تمہارے واسطے
سات رنگوں کی برہنہ قوس ہے
اس کو اپنے طور پر / جب کبھی ترتیب دینا خون کے اک رنگ کو بھی

___ رچھوڑ دینا ان کے نام

جن کی رگ رگ کالے بدبودار قاتل زہر سے بیزار تھی
پھر بھی اسے ڈھونے پہ جو مجبور تھے

جن کو اپنے جسم میں / جیسے لہو کی سرخ دھار
دیکھنے کا عمر بھر ارمان رہا / اور جو اپنے دود کی بے رنگیوں .....
... کی مردہ تفصیلات کی زندہ گواہی دیتے دیتے سو گئے،

___ سلور (دہلی)

ندا فاضلی

پہچان

نہیں !!!

یہ بھی نہیں

یہ بھی نہیں

یہ بھی نہیں

وہ تو !!

نہ جانے کون تھے ؟

یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں

سبھی کی دھڑکنوں میں

ننھے ننھے چاند روشن ہیں

سبھی میری طرح سے

وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں

جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر

مری آنکھوں کے آگے

میرے بچوں کو جلایا تھا

وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ ہیں صاحب !
مگر ہاں پاس ہوں تو
سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اُس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے .....!

——— شاعر (بمبئی)

عمیق حنفی

آئینہ پیش آئینہ

اپنے وجدان کے برگد کے گھنے پیڑ تلے
ایک پل موند کے آنکھیں جو سمیٹا خود کو
دامنِ وقت کی مانند وہ پَل پھیل گیا
جسم اور جان، زماں اور مکاں ایک ہوئے
خود چھلکنے لگا تاریک حجاب
سات رنگوں میں وہ تاریکی بٹی
اور ان رنگوں کے دریاؤں سے
زہرہ، ناہید، ثریا کے مزامیر کا نغمہ اٹھا
بے کراں نور میں گھل مل گئے ساتوں دریا
تیزی ایسی کہ ہزاروں خورشید
ٹھنڈک ایسی کہ ہزاروں مہتاب
بے کراں نور کی تہ میں جب اتر کر کھلیں میری آنکھیں
تیرے آغوش میں رکھے ہوئے میں سر نظر آیا خود کو
بے کراں نور تری آنکھوں میں پایا میں نے
اور اس نور کی تہ میں خود کو.....

——— سطور (دہلی)

شہریار

انتشار سے گھبرا کر

سمیٹو ان بکھرتی ساعتوں کو
بند مٹھی کھول کر آزاد کر دو
ساری سمتوں کو
نگاہوں کی حدوں سے سب مناظر ہٹتے جاتے ہیں
سرابوں کے سمندر کے کنارے کٹتے جاتے ہیں
سرابوں کے سمندر کے مسافر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹتے جاتے ہیں
ہوا کے ہونٹ ان الفاظ کو دہرائے جاتے ہیں
"سمیٹو ان بکھرتی ساعتوں کو
بند مٹھی کھول کر آزاد کر دو
ساری سمتوں کو"

شب خون (الٰہ آباد)

جیلانی کامران

بہار آ رہی ہے

ہمارے مکانوں کے اوپر سے کونجیں
جنوبی علاقے سے آتی ہوئی، چاند تارا بناتی ہوئی
آج گزریں گی، ان کے گزرنے،
مسافت میں روپوش ہونے سے ہم جان لیں گے
کڑاکے کی سردی گئی ہے بہار آ رہی ہے

یونہی گود ماں کی، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا.....
بہار آ رہی ہے
انہی رُخ بدلتے ہوئے، راہ جاتے ہوئے قافلوں کو
کوئی میری جانب سے اتنا کہے
آنے جانے کے پھیلے ہوئے قافلے پر
کہاں سرد موسم رُکے گا
کہاں کس طرف سے بہار آئے گی
سبزہ کن راستوں پر اُگے گا؟

جوانی، بڑھاپا، لڑکپن زمیں اور ماں.....
رفت کے بعد آمد کہاں ہے؟

——— آہنگ (رگیا)

عادل منصوری

شکستہ سورج

شکستہ سورج کے سارے ٹکڑوں کو
کچّے دھاگے سے باندھتا ہوں
رگوں میں پٹرول پھیلتا ہے تو
خالی جیبوں سے چاند تارے نکالتا ہوں
افق کی گردن پہ پاؤں رکھ کر
میں جب بھی سرحد پھلانگتا ہوں
ہزاروں ناخن
خلا میں مجھ کو دبوچتے ہیں
ہزاروں ناخن
اُتار لیتے ہیں کھال میری
ہزاروں ناخن
مری رگوں میں گرہ لگا کر
اسی سے سورج کے سارے ٹکڑوں کو باندھتے ہیں
ہزاروں ناخن
مرے بدن کی شکستہ سرحد پھلانگتے ہیں

سطور دہلی

صادق

ایک پُرانی نظم

کچھ نہیں جانتا
کس طرح آگیا
میں ہوا کے بھیانک طلسمات میں
کوکھ سے جس کی تولید پاتے ہیں بالشتیے
روز و شب ، ہر گھڑی
مجھ میں آتے ہیں ، بے اجازت
کھلی دیکھ کر کھڑکیاں — اور در

موت اور زندگی ان کا اک کھیل ہے
کیونکہ ہر ایک بالشتیہ
موت سے قبل ، جاں سونپ جاتا ہے اپنے کسی جانشیں (دوسرے) کو
دوسرا ، تیسرے
اور پھر ، تیسرا چوتھے بالشتیے کو۔
اس طرح مرتے ۔ جیتے ہزار بالشتیوں اور ان کے طلسمات کا سلسلہ
جنم سے آج تک سوچتا آ رہا ہوں

کتنا مجبور ہوں، چاہتا ہوں
مگر ان طلسمات کا انت، میں دیکھ سکتا نہیں
..... اور ان دیکھے بھی ان کا تبر خفی مجھ کو معلوم ہے

ان طلسمات کا ایک قیدی ہوں میں
ان سے بچھڑا تو لاریب مرجاؤں گا
یہ جو بکھرے تو میں خود بکھر جاؤں گا
..... اور پھر اپنا منہ کھول کر، مجھ کو سالم نگل جائے گی
ایک ڈائن ــــــ (زمیں)

ــــــــــ کتاب (لکھنؤ)

نثار ناصک

عطائے رائیگاں

مرے سینے کو اپنی جگمگاتی انگلیوں سے چیرنے والے
تو مجھ پر میرے آنے والے دن کو بے جہت کر دے
کہ میں نے جس قدر جانا ہے
اُتنے دکھ اٹھائے ہیں
مرے اندر مرے سارے سفر کا
بے نوا بیکار پن
آتش فشاں لاوے کی صورت سانس لیتا ہے
کہ جیسے بند جوہڑ کے کھڑے پانی میں کیڑے کلبلاتے ہیں
تعفن ــــ ان گنت لفظوں کی لاشوں پر بچھے
کالے کفن کا ماتمی لمحہ ــــ
میں تیرے علم کی بخشی ہوئی مجبوریوں کے حبس میں
اپنی کراہیں نظم کرتا ہوں
نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
مرے سینے کو آ کر کھول
اپنا علم اپنا اور مجھ سے چھین لے
لیکن مجھے پھر سے مری حیرانیاں دے دے!

ــــ تحریک (دہلی)

ظہیر صدیقی

اسیرِ ذات روشنی

نہ لذتوں کا بحر تھا
نہ خواہشوں کی وادیاں
نہ دائرے ثواب کے
نہ زاویے عذاب کے
بس ایک روشنی اسیرِ ذات تھی — محیطِ کائنات تھی
ازل سے بے لباس تھی

تو یوں ہوا کہ دفعتاً
مرے بدن کے پیرہن میں چھپ گئی
تو لذتوں کا بحر موج زن ہوا
تو خواہشوں کی وادیاں سلگ گئیں
تو دائرے ثواب کے پھسل گئے
تو زاویے عذاب کے مچل گئے

عجیب واقعہ نہیں
مرے بدن کا پیرہن تو لذتوں کے تار میں بُنا گیا
وہ خواہشوں کے بحر میں

جو موج موج بہہ گیا

تو کیا ہوا

یہ راز راز رہ گیا کہ خواہشوں سے بے نیاز روشنی

(جو قبل ارتکاب ہی

مرے بدن کے پیرہن میں جانشین تھی)

سدا ارتکاب کیوں ہوئی نہیں

نہیں ؟

تو پھر

سزا میں وہ شریک کیوں ہوئی نہیں

——— کتاب (لکھنؤ)

کرشن مراری

نظم

میں نے اک انجان نگر میں
ایک مکاں پر دستک دی ہے
مجھ کو یہ آشا تھی کوئی فرشتہ سیرت
اپنی بصیرت، اپنے نورِ دل سے میرا رہبر ہوگا
لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں
سناٹے کا بھوت کھڑا ہے
بے حس وحشت کا اک پیکر
"زہر آمیز ہنسی ہنستا ہے"

——— تحریک (دہلی)

زاہدہ زیدی

جنگل

زیست کی تنگ پیچیدہ راہوں پہ
چلتے ہوئے
ایسے پُر ہول جنگل میں ہم کس طرح آ گئے
سخت سوکھی زمیں پر
درختوں کے بوجھل تنے
تندخو اور وحشی درندوں کی مانند
پنجے جمائے کھڑے ہیں
ان کی سوکھی ہوئی زرد شاخوں
انسانوں کے ہاتھ پاؤں
کٹے سر
کٹے جسم
بازو
بازوؤں اور ٹانگوں سے محروم دھڑ
ناک نقشے سے محروم چہرے

ہر اک سمت لٹکے ہوئے ہیں
راستے منتشر
پُرخطر راستے
ایک مبہم اندھیرے میں گم ہیں
اور ان راستوں میں
کٹی انگلیاں
کان
الجھے ہوئے بال
ویران آنکھیں
چھدے ہونٹ
ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں

زخم خوردہ ٹھٹکتے قدم
خود بخود رک گئے ہیں

کوئی انسان مجھ کو ملے گر
تو پوچھوں: کہ کیا میں ابھی تک
وہی شعلہ اندام سیماب پا
ذوقِ ہستی سے بے تاب درد آشنا
ایک انسان ہوں
یا فقط کوئی ٹوٹا ہوا ہاتھ،
بازو،
کوئی ناک نقشے سے محروم چہرہ ہوں میں
اور یوں
سخت شاخوں سے لٹکی ہوئی ہوں

کوئی سرشار جذبوں کی جوئے رواں ہو
تو دیکھوں
کہ کیا میری آنکھوں کی گہرائیوں میں
ابھی تک وہی جرأتِ دید ہے
رفعتِ ذوقِ پرواز ہے
اور کیا میرے اعضا کے خم
اور میرے خدوخال ابھی
زندگی کی صراحت کے غماز ہیں
لذتِ آگہی کے امیں ہیں
یا کہ اب میں بھی بس
کچھ کٹے کان
ویران آنکھیں
چھدرے ہونٹ
بکھرے ہوئے بال ہوں
اور یوں
نیم تاریک گم نام راہوں میں
بکھری ہوئی ہوں

——— محسب خون (الہ آباد)

کہ مایوس لمحے، پژمردہ سے ہو کر
خوبصورت زبان سننا چاہتے ہیں
لیکن مری عبادت کسی بھی کھوج کے لیے نہیں ہے
چند سال پہلے میں اس بلندی پر پہنچا تھا
وہاں صرف جنگل تھے، آدمیوں کا قحط تھا
میں اکیلا تھا، اور وہ کسی خوابناک بستی میں خود کو محسوس کرنے گیا تھا
دراصل وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے
اور میں آزاد ہوں
کہ تم یہ سچ مانو: میں نے تمھیں ہرگز دیکھا نہیں

——— تحریک (دہلی)

حمیدہ فاروق

ایک نظم

تیئس برس سے وہ گھر سے باہر نہیں نکلا
سب دروازے بند پڑے ہیں
باہر کا خوف اسے سونے نہیں دیتا
اندر گہری رات چیخ رہی ہے
اور باہر سرخ آندھی ......

ایک پاگل کتا اپنی لمبی، تھوکتی جیبھ لٹکائے
شہر کی سڑکوں پر
تیئس برس سے گھوم رہا ہے
اسے ڈھونڈ رہا ہے

سطور (دہلی)

مصحف اقبال توصیفی

خوف

خوف سے میرے لب
آسماں کی طرح نیلے۔
آنکھیں پربت کی مانند
بے جان ہیں

یہ کیلنڈر۔۔۔
اس کو چھپا دو کہیں
اس گھڑی کو کہیں دفن کر دو
یہ ٹک ۔۔۔ ٹک ۔۔۔۔

یہ سورج کہ انجن میں دہکے ہوئے
کوئلے ہیں
ستارے
پہیوں کے مانند لڑھکے چلے جا رہے ہیں
کہاں ؟

مرے کان میں ریل کی چیخ بجنے لگی ہے
میری سانسوں سے کالا دھواں سا
نکلتا ہے ۔۔۔! میں
کہاں جا رہا ہوں

۔۔۔ وقت ۔۔۔۔
ریل کی پٹریوں سے پھسل کر۔۔۔
نیچے گرنے کو ہے

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

سرود کامران

وجود کا سفر

میں زلزلوں کی زمین پر
دم بخود کھڑا اجنبی مسافر
میں کس زمیں پہ قدم جماؤں
میں کس فضا پر نظر لگاؤں
قدم اٹھاؤں کدھر۔ کہ تقدیر میری ہر راہ میں کھڑی ہے
پرانی دانش۔ کہ ڈوبتے پانیوں پہ تختے کی بے یقینی
کسی جزیرے، کسی زمیں کی تلاش میں ہے
مرا ہوا وقت تربتوں میں بٹا ہوا ہے
ادھر وہ ہر لحظہ دور ہوتے حسیں مناظر
مری ندامت کا جسم عریاں
ادھر یہ قبروں کے سلسلے اپنے پچھلے قدموں پہ ہٹ رہے ہیں
سمٹ رہے ہیں
میں وقت کی گھومتی گرجتی نیاگرا سے قدم قدم پنجہ آزما ہوں
ازل سے بوچھار سہہ رہا ہوں
مجھے تو جلتی ہوا کا دامن پکڑ کے اس خاکداں کو چھوڑ دوں
نہیں بہت ہے

بہت ہے جتنی بھی عمر گزری
فضا میں جاتے ہوئے پرندو!
مجھے اسی گھر میں چھوڑ جاؤ
یہ گھر بھی میرا — زمیں بھی میری
میں زلزلوں کی زمین پر دم بخود کھڑا اجنبی مسافر!
مرے قدم کی حریص مٹی
مرے لہو کو پکارتی ہے
مجھے نگلنے کو مضطرب ہے

——— مورچہ دگیا،

سید حبیب

نظامِ زیست

نظامِ زیست کسی تال کا نہیں پانی
جو سنگ بستہ سا ٹھہرا ہوا مقید ہے
ہر آنکھ دیکھ سکے جس کی آتی لبس جیسے ہے
کرے نہ کچھ بھی جو پیدا دلوں میں حیرانی
نظامِ زیست کسی تال کا نہیں پانی

نظامِ زیست ہے لیکن وہ بے کراں پانی
پہاڑیوں سے جو نکلا ہو بن کے مستانہ
کسی کی آرزوئے وصل کا ہو دیوانہ
یہاں سے دور بہت دور کوہساروں میں
دراز راہوں میں، دشوار رہ گزاروں میں
وہیں، جہاں یہ سلیں برف کی پگھلتی ہیں
جہاں ابلتے ہیں چشمے، ہوائیں چلتی ہیں
وہیں سے تو یہ ندی نالے بہتے آتے ہیں
جو پتھروں کو، چٹانوں کو چیر جاتے ہیں

پٹانیں کاٹ کے جاتے ہیں یہ جدھر جائیں
نکل کے کوہ سے میداں سے یہ گزر جائیں
یہ ہم کنار ہوئے اور بڑھ گیا . پانی
ہر ایک سمت کو بکھر کھیلتا چلا پانی
یہ جنگلوں میں گزرتا تو گھاٹیوں میں کبھی
یہ پھیلتا کبھی میداں میں وادیوں میں کبھی

ہوئی ہے جس سے بشر کی نظر کو حیرانی
نظامِ زیست ہے گویا وہ بے کراں پانی

——— تحریک (دہلی)

وہاب دانش

وہ لمحہ

طے کر لوں یہ رات کا جنگل
پی لوں تھوڑا
گدلے دریاؤں کا یہ بے رنگ سا پانی
اپنی کھلی ہتھیلی سے میں
چھو لوں ٹھنڈی ریت کی نرمی

سورج کے آنے تک
اپنی ساری آرزوؤں کو
ٹھوس کناروں کی پہچان بتا دوں
شاید تھوڑی دیر کی مہلت
زرد اُجالے میں مل جائے
وقت کے پتھر کے نیچے
اِن دبے ہوئے ہاتھوں کو
وہ لمحہ مل جائے

سطور (دہلی)

عباس اطہر

ہل ٹیڑھا ہے

شیشے کے بدن میں رہتا ہوں
میں آج ہوں میرے آگے پیچھے کل ہیں
پھر بھی تن تنہا ہوں
حاملہ مٹی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
سر اور پیر تصادم میں ہیں
تاریکی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں
کچی موت کے بعد جونہی زندہ ہوتا ہوں
میرے سرہانے نئی نویلی دلہن، دھوپ دہک اٹھتی ہے
سر اور پیر تصادم میں، حقِ زوجیت ماتھے پر
صبح سویرے کلمہ پڑھ کے نہانا،
فصل کے پک جانے تک کھیت کو پانی دیتے جانا
میں نے یہی سنا ہے
حاملہ مٹی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
بیل ہوں، پتھریلی کھیتی میں
ہانپ گیا ہوں ہل ٹیڑھا ہے
خصی بیلوں کی سب جوڑیاں

۵۲:

پتھریلے کھیتوں میں ہانپ چکی ہیں
بیج بکھرنے کے آسن بھی بدل چکے ہیں
جانے پیدائش کا لمحہ کب آئے گا
مجبوری کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہا ہوں
پھیکے موسموں اور وقتوں کی
عمر بڑی ہے، ہانپ گیا ہوں

________ شعر و حکمت (حیدرآباد)

کمار پاشی

میں نے سوچا ہے' موجود میرا نہیں
سر پھری آنکھ میرے تعاقب میں ہے اور نیلے درختوں کے جنگل کی سرحد ابھی دور ہے
شہر بھر میں منادی کرادو کہ امشب نہ جاگے کوئی
تاکہ میری شکستوں کا منظر نہ اس بار دیکھے کوئی
میں نے سوچا ہے : موجود میرا نہیں
اب کسی شے پہ دل کو بھروسہ نہیں
اور نیلے درختوں کے جنگل کی سرحد سے پہلے کئی اجنبی شہر ہیں جن سے موجِ ہوا
کے سوا آج تک کوئی گزرا نہیں !

ماجھیو !
آہنی رسیاں کھول دو
سر پھری آنکھ پھر سے تعاقب میں ہے ، بادباں کھول دو
اور غصیلے جہازوں کو نیلی تہوں میں اتر جانے دو
ہر بلا سے گزر جانے دو
وہ جو موجود ہے اُس کو مر جانے دو

دور جاتے ہوئے ایک موہوم سایے کے اندر مری آتما قید ہے
کوئی منظر مری دسترس میں نہیں
جسم و جاں میرے بس میں نہیں

میں کہ اب ایک مٹتا ہوا لفظ ہوں، اپنے مفہوم سے دور ہٹتا ہوا
خود سے کٹتا ہوا

سر پھری آنکھ میرا تعاقب نہ کر، میں نے دیکھا ہے اک آدمی آج مرتا ہوا
اپنے اندر اُترتا ہوا
میں نے سوچا ہے: موجود میرا نہیں
اور سرابوں کی ماری ہوئی دور تک رنگتی اس زمیں کا بھروسہ نہیں
اور یہ طے ہے کہ جس کے سبھی منتظر ہیں یہاں، اس کو آنا نہیں
کچھ نہ سوچو —— بڑھو!
آہنی رسیاں کھول دو
سر پھری آنکھ پھر سے تعاقب میں ہے، بادباں کھول دو
مانجھیو!

—— تحریک (دہلی)

غزلیں

احمد ندیم قاسمی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا، راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا

اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا بہ سحر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا، مگر صبح تو کر جاؤں گا

مسطور (دہلی)

گوپال مِتّل

کام آیا نہ ہوس کا بھی سہارا یارو
سخت تھا مرحلۂ ترکِ تمنّا یارو

بارِ عشرت تو نہیں ہے کہ رفاقت ڈھونڈیں
بارِ غم کا ہے، اٹھاؤ اسے تنہا یارو

آج کے بعد نہ ہو بارِ سماعت شاید
میرا شکوہ کہ جو تھا شکوۂ بیجا یارو

اتنی بھی خوں شدنِ دل کی شکایت کیوں ہے
تھا یہ منجملۂ آدابِ تمنّا یارو

میں نہیں خاکئ بیدادِ زمانہ، کہ میں ہوں
اپنی ہی روشنئ طبع کا مارا یارو

——— سطور (دہلی)

خورشید احمد جامی

سورج سروں پہ آگ اگلتا دکھائی دے
مجھ کو یہ شہر آج پگھلتا دکھائی دے

وہ سامنے رکھا ہے کوئی خط کھلا ہوا
وہ دور کوئی چاند نکلتا دکھائی دے

کس کے قریب جائیے، کس کو پکاریے
ہر شخص اپنا روپ بدلتا دکھائی دے

میں اس ندی کے پار اُتر جاؤں گا مگر
آگے کوئی چراغ تو جلتا دکھائی دے

یہ ریگ زارِ غم، یہ خیالوں کی تیز دھوپ
جو زد میں آگیا وہ پگھلتا دکھائی دے

گھر ہو کہ راستہ ہو، اک آسیب ہر جگہ
تنہائیوں کا زہر اُگلتا دکھائی دے

آواز دے کہ رات کے اونچے پہاڑ سے
خوابوں کا پا تو آج پھسلتا دکھائی دے

جامیؔ مری نظر میں زمانہ ہے اس طرح
پھولوں کو جیسے کوئی مسلتا دکھائی دے

—— سطور (دہلی)

بسمل کرشن اشک

بپھرائی بپھرائی موجیں، کوسوں دور کنارا سا
اُوپر بادل، نیچے جل تھل، آنکھ تلے اندھیارا سا
پت جھڑ کی کالی راتوں میں آنکھیں چندھیا جاتی ہے
ماضی کی امرائی سے دو لونگوں کا لشکارا سا
پکتے گڑ کی خوشبو پھیل گئی بھونرالی راتوں میں
گانو، کارتہ ٹھمک ٹھمک کر من کو کرے اشارا سا
اس کو کیا معلوم نہیں تھا جوگی کس کے میت ہوئے
کٹیا میں دو ایک گھڑی کو ہو تو گیا اجیارا سا
پاکیزہ احساس کے ہاتھوں پیاس کی کیسی موت ہوئی
خشک لبوں پر زباں پھیرتا، ڈولے بدن تپیارا سا
کوئی چمکتی سی شے میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
آنکھیں جدھر گھماؤں، گھومے اسی طرف انگارا سا
بیچارے کے پانو کبھی دہلیز کبھی دروازے پر
گھوم رہا ہے گھر میں بندھا بندھا ایک بنجارا سا

——— تحریک (دہلی)

شہزاد احمد

چپ کے عالم میں وہ تصویر سی صورت اس کی
بولتی ہے تو بدل جاتی ہے رنگت اس کی

سیڑھیاں چڑھتے اچانک وہ ملی تھی مجھ کو
اس کی آواز میں موجود تھی حیرت اس کی

ہاتھ چھو لوں تو لرز جاتی ہے پتے کی طرح
وہی ناکردہ گناہی پہ ندامت اس کی

کسی ٹھہری ہوئی ساعت کی طرح مہر بہ لب
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی یہ اذیت اس کی

آنکھ رکھتے ہو تو اس آنکھ کی تحریر پڑھو
منہ سے اقرار نہ کرنا تو ہے عادت اس کی

خود وہ آغوش کشادہ ہے جزیرے کی طرح
پھیلے دریاؤں کی مانند محبت اس کی

روشنی روح کی آتی ہے مگر چھن چھن کر
سست رو ابر کا ٹکڑا ہے طبیعت اس کی

ہے ابھی لمس کا احساس مرے ہونٹوں پر
ثبت پھیلی ہوئی باہوں پہ حرارت اس کی

وہ اگر جا بھی چکی ہے تو نہ آنکھیں کھولو
ابھی محسوس کیئے جاؤ رفاقت اس کی

دل دھڑکتا ہے تو وہ آنکھ بلاتی ہے مجھے
سانس آتی ہے تو ملتی ہے بشارت اس کی

وہ کبھی آنکھ بھی جھپکے تو لرز جاتا ہوں
مجھ کو اس سے بھی زیادہ ہے ضرورت اس کی

وہ کہیں جان نہ لے ریت کا ٹیلا ہوں میں
میرے کاندھوں پہ ہے تعمیر عمارت اس کی

بے طلب جینا بھی شہزاد طلب ہے اس کی
زندہ رہنے کی تمنا بھی شرارت اس کی

——— شب خون (الہ آباد)

شاذ تمکنت

پیاسا ہوں، ریگ زار میں دریا دکھائی دے
جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

ہر تازہ واردِ خمِ گیسو کو دیکھ کر
مجھ کو پھر اپنا عہدِ تمنا دکھائی دے

قربت کی آنچ آئی کہ جلنے لگا بدن
دوری کا درد آج چمکتا دکھائی دے

لہجے کے لوچ میں ہے گناہوں کی دلکشی
آنکھوں میں معبدوں کا سویرا دکھائی دے

ہر زاویے کو جسم کے، اہلِ نظر کی پیاس
ہر خط ترے بدن کا سراپا دکھائی دے

چھپتے ہوئے لباس کا چھنتا ہوا جمال
بُت گر نقابِ سنگ الٹتا دکھائی دے

پڑتی ہے سات رنگوں پہ تیرے بدن کی چھوٹ
جو رنگ تو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے

کیا کیا حقیقتوں پہ ہیں پردے پڑے ہوئے
تو ہے کسی کا اور کسی کا دکھائی دے

خلوت کی انجمن ہے وفاؤں کا سلسلہ
کیا ذکرِ عشق حسن بھی تنہا دکھائی دے

اس آس نے تو اپنا سفینہ ڈبو دیا
طوفاں تھمے تو کوئی جزیرا دکھائی دے

دریا پہ آنسوؤں کے تجھے ڈھونڈتا ہوں میں
پانی پہ تیرا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

ہر شخص اپنے آپ تعاقب میں ہے رواں
عالم تمام ایک تماشا دکھائی دے

آؤ کہ دیکھ آئیں فراموشیوں کا شہر
ممکن ہے کوئی اپنا، پرایا دکھائی دے

مخدوم و جامی آہ کہاں کھو کے رہ گئے
ارضِ دکن میں شاذ اکیلا دکھائی دے

سطور (دہلی)

حسن نعیم

مری زبان کھلی بھی تو کیا سزا دے گا
بہت ہوا تو مجھے بزم سے اٹھا دے گا

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں
کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

جہاں سے نعرۂ مستاں دہاں سے شہنائی
دبا یہ شور تو نغمہ ہمیں سلا دے گا

بلا سے راہ کو روکے کھڑا ہے اک مجمع
کوئی تو بھیڑ سے بچنے کا راستا دے گا

کسے یقین رہا ہے کہ حاکمِ دوراں
مری وفا کا مرے دور کو صلہ دے گا

بہت سے باغی و سرکش ہیں قیدیوں میں حسنؔ
کوئی تو جان پہ کھیلے گا سر کٹا دے گا

—— کتاب (لکھنؤ)

بشیربدر

سیپکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے
سویرے میری اِن آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا ہوا ہے
اندھیری رات کا تنہا مسافر
مری پلکوں پہ اب سہما کھڑا ہے
سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے
حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کیسا بوڑھا دیوتا ہے
پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے
ہماری شاخ کا نو خیز پتہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے
مجھے اُن نیلی آنکھوں نے بتایا
تمھارا نام پانی پر لکھا ہے

محمد علوی

بھید کچھ کھلتا نہیں دیوار و در میں کون ہے
گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں میرے گھر میں کون ہے

سب کے سب پاگل نظر آتے ہیں مجھ کو شہر میں
میرے جیسا اور پاگل شہر بھر میں کون ہے

حق بجانب کون ہے اب آپ ہی بتلائیے
میں نہیں بتلاؤں گا میری نظر میں کون ہے

دل کے ملبے میں پڑا ہے اور چلاتا نہیں
ڈوبتا ہے اور چپ ہے، چشم تر میں کون ہے

کون اپنا گھر اٹھائے پھر رہا ہے در بدر
گھر میں بیٹھا ہے مگر ہر دم سفر میں کون ہے

سوچتا رہتا ہوں علوی پر سمجھ پاتا نہیں
میں نہیں تو اس بلا کے شور و شر میں کون ہے

خلیل الرحمن اعظمی

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

ایک مدت سے ہے دل کاسۂ خالی کی طرح
کسی شیشے میں لہو ہو دے تو بھر دے کوئی

ہر جگہ ساتھ رہے گی یہی دیوار کی قید
سر چھپانے کو ہمیں کون سا گھر دے کوئی

جیسے شاداب کیا شاخِ نہالِ غم کو
شجرِ خواب کو بھی برگ و ثمر دے کوئی

میرِ محفل کو گوارا نہیں یہ طرزِ کلام
شمعِ کشتہ کو جو عنوانِ سحر دے کوئی

اب ادا ہو نہ سکے گی مرے سر کی قیمت
سنگِ دشنام دے یا لعل و گہر دے کوئی

صاحبِ فن کو بس اک لمحۂ تخلیق بہت
ورنہ بے سود اگر عمرِ خضر دے کوئی

——— شب خون (الٰہ آباد)

من موہن تلخ

اب اور سانحے ہم پر نہیں گزرنے کے
گزر گئے ہیں جو لمحے تھے خود سے ڈرنے کے

نہ بھاگنے کے رہے ہم نہ اب ٹھہرنے کے
وہ لمحے آئے جو آکر نہیں گزرنے کے

نئے سرے سے تعلق بنیں گے بگڑیں گے
کہ اب ارادے ہیں ایک ایک بات کرنے کے

یہ ایک عرصے کی چپ کی خراش اور رہی
صدا کے زخم تو چپ سے نہیں تھے بھرنے کے

دلوں میں ہول وہ بیٹھا ہے اڑتی باتوں کا
نہ روکنے کے کسی کو نہ خود ٹھہرنے کے

جو آئے جی میں وہ کہہ لیکن اتنا دھیان رہے
کہ خود پہ ہم نہیں الزام اور دھرنے کے

تو کیا ہوا جو ندی نے بلی نہیں مانگی
فسانے گڑھ نہ لیے سب نے پار اترنے کے

بنا کے تم مری باتیں مرے لیے الزام
نہ بولنے کے رہے ہو نہ چپ ہی کرنے کے

بڑے بڑوں نے جہاں آکے دم نہیں مارا
وہ آئے مرحلے اپنی صدا سے ڈرنے کے

ہم ایسے آئے ہیں جیسے ملیں گے پہلی بار
نئے نئے سے ہیں سب درد بات کرنے کے

یہاں سے جاؤ تو اک اپنے جیسا چھوڑتے جاؤ
عجب رواج ہیں اس شہر سے گزرنے کے

ہر ایک صبح ہے امکانِ سانحہ، ہر شام
صدائیں آتی ہیں یہ دن نہیں تھے مرنے کے

کہو ہر اک سے کہ ہر شخص یاد کھو بیٹھا
بغیر اس کے یہ چہرے نہیں نکھرنے کے

ہر ایک بات اترنے لگی ہے ذہن سے تلخ
بہت قریب ہیں اس لمحے ہم بکھرنے کے

—— آہنگ (گیا)

بانی

میں چپ کھڑا تھا، تعلق میں اختصار جو تھا
اسی نے بات بنائی، وہ ہوشیار جو تھا

پٹخ دیا کسی جھونکے نے لا کے منزل پر
ہوا کے دوش پہ کب سے کوئی سوار جو تھا

محبتیں نہ رہیں اس کے دل میں میرے لیے
مگر وہ ملتا تھا ہنس کر کہ وضعدار جو تھا

عجب غرور میں آ کر برس پڑا بادل
کہ پھیلتا ہوا چاروں طرف غبار جو تھا

قدم قدم رم پامال سے میں تنگ آ کر
ترے ہی سامنے آیا ترا شکار جو تھا

چھپا کے رکھا تھا اس نے مرے لیے کوئی زہر
وہ میرے ٹوٹتے نشے کا رازدار جو تھا

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

زبیر رضوی

تھا حرفِ شوق صید ہوا کون لے گیا
میں جس کو سن سکوں وہ صدا کون لے گیا

اک میں ہی جامہ پوش تھا عریانیوں کے بیچ
مجھ سے مری عبا و قبا کون لے گیا

باتوں کا حسن ہے نہ کہیں شوخیٔ بیاں
شہرِ نوا سے حرف و صدا کون لے گیا

میں کب سے ہوں اسیر سرابوں کے جال میں
نیلے سمندروں پہ گھٹا کون لے گیا

میخانہ چھوڑ گھر کی فضاؤں میں آ گئے
ہم سے متاعِ لغزشِ پا کون لے گیا

میں جب نہ تھا تو مجھ پہ بہت قہقہے لگے
احباب سے سرشتِ وفا کون لے گیا

شب خون الٰہ آباد

نشتر خانقاہی

کیوں بیاباں بیاباں بھٹکتا پھرا، کیوں پریشاں رہا، غم گزیدہ رہا
آج اک نوجواں مجھ سے کہنے لگا، قیس پاگل تھا، دامن دریدہ رہا

میری راہوں میں گمنام گلیاں بھی تھیں، قصرِ یاراں بھی تھا، شہرِ اغیار بھی
میں کسی آستانے کا پتھر نہ تھا، بوئے گل تھا کہ ہر سو پریدہ رہا

جانے کتنے مسافر یہاں آئے ہیں، ان گنت نام ہیں نقش محراب پر
اک پرانی عمارت کے سائے تلے میں بہت دیر تک آب دیدہ رہا

اجنبی بن کے راتوں کی تنہائی میں، مجھ سے میرا پتہ پوچھتے ہی رہے
یہ مرے لب جو برسوں مقفل رہے، یہ مرا سر جو صدیوں خمیدہ رہا

تم کتابوں میں محفوظ کر لو مجھے، کیا عجب ہے کوئی پڑھنے والا ملے
میں وہ آواز ہوں جس کا سامع نہیں، میں وہ لہجہ ہوں جو ناشنیدہ رہا

—— شب خون (الہ آباد)

راج نرائن راز

کوئی پتھر ہی کسی سمت سے آیا ہوتا
پیڑ پھل دار میں اک راہ گزر کا ہوتا

اپنی آواز کے جادو پہ بھروسہ کرتے
مور جو نقش تھا دیوار پہ ناچا ہوتا

ایک ہی پل کو ٹھہرنا تھا منڈیروں پہ تری
شام کی دھوپ ہوں میں کاش یہ جانا ہوتا

پھول کاغذ کے مجھے آپ نے بھیجے کیوں ہیں
ایسا بے حس نہ مجھے آپ نے سمجھا ہوتا

لذتیں قرب کی اے کاش ہمیشہ رہتیں
شاخِ صندل سے کوئی سانپ ہی لپٹا ہوتا

آپ کا قد مرے مصرعے سے ذرا سا کم ہے
آپ کس زعم میں ہیں آپ نے دیکھا ہوتا

ایک ہی نقش سے سو عکس نمایاں ہوتے
کچھ سلیقے ہی سے الفاظ کو برتا ہوتا

——— کتاب (لکھنؤ)

مظہر امام

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ دکھائی نہ دے
سکوت وہ کہ دھماکہ بھی اب سنائی نہ دے

پہنچ گیا ہوں زمان و مکاں کے ملبے تک
مری انا! مجھے الزام نارسائی نہ دے

اگر کہیں ہے تو دل چیر کر دکھا مجھ کو
تو اپنی ذات کا عرفان دے، خدائی نہ دے

ازل کے ٹوٹتے رشتوں کی اس کشاکش میں
پکارا اپنی ادا سے، مجھے سنائی نہ دے

میں اب تو بھولنے والا ہوں واقعہ سارا
پرانی بات ہوئی، اب مجھے صفائی نہ دے

مرے زوال کے در پر عروج کی دستک
ذرا قریب سے سن، طنزیہ بدھائی نہ دے

نکل گیا ہوں میں اپنی کمان سے آگے
تعلّقات گزشتہ کی اب دہائی نہ دے

—— سطور (دہلی)

ممتاز راشد

ہر چہرے پر خوف کی چادر شعلوں کی بارش گھر گھر
سونی آنکھیں دیکھ رہی ہیں جلتے شہر کا یہ منظر

پتا بھی کھڑکے تو دل سینوں میں خوف سے پھٹ جائیں
کتنی چیخوں کا مدفن ہے سہما سہما خاموش نگر

چہرے کی تحریر کے پیچھے کیا دکھ ہے یہ بھی سمجھو
میں کوئی اخبار نہیں ہوں تم رکھ دو جس کو پڑھ کر

ہم ہی کچھ نادان تھے جانے کتنے خواب سجا بیٹھے
اس نے یوں ہی دیکھ لیا تھا چلتے چلتے ایک نظر

جب بھی گزرتا ہے کوئی آوارہ ہواؤں کا جھونکا
تپتی ٹین کی اونچی چھت پہ بجنے لگتے ہیں کنکر

پیچھے رہ جانے والوں پر کس منہ سے الزام دھریں
ہم جس کی اگلی صف میں تھے ہار گیا ہے وہ لشکر

کوئی پتھر پھینک کے اس میں اپنا عکس ہٹا ڈالیں
جلتی ریت میں کھو جائے گی یہ ندی آگے چل کر

راشد کس امید پہ دل کا آئینہ چمکاتے ہو
جانے کیا تصویر دکھائے دھندلا دھندلا سا منظر

ـــــ سطور (دہلی)

مصور سبزواری

گھورتے رستوں کا آسیب بنا ہوں میں تو
مجھ سے مل پاؤ گے کیا شام بلا ہوں میں تو

دیوتاؤں سے نہ ہوگا مرا درمانِ زوال
آسمانوں کے سنگھاسن سے گرا ہوں میں تو

جاتے موسم کی طرح اس سے کبھی مل نہ سکا
ایک لمحے کے تعلق کی سزا ہوں میں تو

لوگ گلیوں میں ہی ڈھونڈا کیے آندھی کے سراغ
اپنی آنکھوں کے حصاروں میں بجھا ہوں میں تو

زہر بن کر وہ مصور مری نس نس میں رہا
میں نے سمجھا تھا اسے بھول چکا ہوں میں تو

فکرو حکمت (حیدرآباد) ——

سلطان اختر

قدم اٹھاتے ہی چکرا کے گر پڑیں ہم بھی
تمہاری طرح سنبھل کے اگر چلیں ہم بھی

پسینے پونچھ رہی ہے ہوا درختوں کے
تھکن کی گرد کہیں رک کے جھاڑ لیں ہم بھی

وہ لکھ رہے ہیں اندھیرے میں کچھ ہتھیلی پر
اجالا ہو تو ذرا غور سے پڑھیں ہم بھی

بدل کے بھیس حریفوں کی فوج نکلی ہے
کسی طرح کا کوئی روپ دھار لیں ہم بھی

ٹھہر گئی ہے کڑی دھوپ ایک مرکز پر
دبیز چھاؤں ملے تو کہیں رکیں ہم بھی

فصیل لب پہ جمے ہیں سکوت کے شیشے
زباں کو زخم لگائیں تو کچھ کہیں ہم بھی!

ـــــ مطبوعہ (رگیا)

ناصر شہزاد

بے حس ہوا من ، سرد بدن ، پران گئے تھک
تج کر تری سنگت ملیں کج بختیاں ، کالک
ذاتوں میں تفاوت تھا ، علاقوں میں جدائی
یوں موہ ، ملن پر نہ بنا تیرا مرا حق
خود دھنے ، وچن جوڑے ۔ نبھائے ۔ پھری ، توڑے
نت سنگ مرے کھیلے ہیں تو نے یہی ناٹک
دوری ہی بچا ۔ اب کے بھی پہلے کی طرح آ
ساون چڑھا ، مدھ مینہاں پڑا ، آم گئے پک
پھر کیا جو بندھا بیاہ کا اک اور سے بندھن
چاہا ہے ازل سے تجھے ، چاہوں گا ابد تک
آباد اُسی ارض پہ ہے اُس کا نگر بھی !
وہ خطّہ وہی ہے جہاں گزرے گرو نانک
سب جگت اگت نرک بنے تجھ سے بچھڑ کر
تو سانسوں کا آنند تھی ، تو آنکھوں کی ٹھنڈک
آخر تجھے اپنانا ہے جُگ بیتیں کہ جیون
سنچا ہے مرا کشٹ ، مری سادھنا برحق

—— سطور (دہلی)

کرامت علی کرامت

جو نقوش ابھرے یہاں احساس کے آئینے میں
مٹ کے ضو بار نہ ہوں یاس کے آئینے میں

جس کو اُمید کے پردے پہ بھی دیکھا نہ کبھی
وہی آتا ہے نظر یاس کے آئینے میں

دل کی تسکین کو کافی ہے یہاں موجِ سراب
دیکھیے اس کو ذرا پیاس کے آئینے میں

کیوں گنہ سے نہ منور ہو ضمیرِ انساں
کوئلہ چمکے ہے الماس کے آئینے میں

سنگِ امروز سے فردا کو بچاؤں کیسے
بال جب پڑ ہی گئے آس کے آئینے میں

——— سطور (دہلی)

Scanned with CamScanner

پرکاش فکری

پتھر کی ہتھیلی پہ کوئی پھول اُگا دے
ذرّوں کی تب و تاب سے سورج کو جلا دے

الفاظ کے سینے میں بہکتے ہوئے خوں سے
کاغذ پہ کسی خواب کی تصویر بنا دے

اُترا ہے پہاڑوں سے غضب ناک اندھیرا
ایسے میں کوئی چیخ کے مجھ کو نہ ڈرا دے

گلیوں میں ہوا رات کو روتی ہے اکیلی
پھیلے ہوئے جنگل کی اُسے راہ بتا دے

ہے دور بہت دور، وہ سرسبز جزیرہ
جائے گا وہاں کون کہ تھکتے ہیں ارادے

ساحل پہ ترے ساتھ تھا فکری تو ہُوا کیا
موجوں میں کبھی ڈوب کے تو اس کو صدا دے

——— آہنگ (گیا)

نازش انصاری

جو رات بھر ترے خوابوں میں گھومتا ہوگا
وہ میں نہیں مری صورت کا دوسرا ہوگا

حقیقتوں کا مجھے تجربہ نہیں، میں چلا
کوئی سراب مری راہ دیکھتا ہوگا

ہماری قبر کا کوئی نشاں نہیں، پھر بھی
ہماری قبر پر اک شخص رو رہا ہوگا

جنوں بنے تو شرارہ، وفا بنے تو گلاب
وہ دل کے بارے میں اتنا تو جانتا ہوگا

تمھارے ہاتھ تمھیں کو ہلاک کر دیں گے
ہمارے بعد تمھارا بھی فیصلہ ہوگا

ہر ایک لمحہ ہے مصروف پھر بھی بے مقصد
ہمارے عہد کا انجام جانے کیا ہوگا

—— تحریک (دہلی)

شمیم حنفی

بس ایک وہم ستاتا ہے بار بار مجھے
دکھائی دیتا ہے پتھر کے آر پار مجھے

مرا خدا ہے تو مجھ میں اتار دے مجھ کو
کہ ایک عمر سے اپنا ہے انتظار مجھے

میں لفظ لفظ بکھرتا رہا فضاؤں میں
مری صدا سے وہ کرتا رہا شکار مجھے

جو ڈھال دیتے ہیں پرچھائیوں کو پتھر میں
اب ایسے سخت دلوں میں نہ کر شمار مجھے

ہوا کچھ ایسی چلی خون کا نشاں نہ ملا
غبارِ راہ کو تکتا ہوں میں، غبار مجھے

حصارِ مرگ میں گھٹ جائے گی صدا تیری
تو دور ہے تو ذرا دیر تک پکار مجھے

—— شعر و حکمت (حیدرآباد)

آزاد گلاٹی

دل کے صحرا پر دیتے ہیں جب اشکوں کے ساگر دستک
روح کے سناٹے میں سنتا ہوں میں اندر باہر دستک

اب تک ہر شب سوتے سوتے چونک اٹھتا ہوں تنہائی میں
مدت بیتی میں نے سنی تھی اک شب اپنے در پر دستک

شام کا ڈھلتا سورج، وہ افق پر ٹھہرا سوچ رہا ہے
کب شب بیتے اور وہ دے پھر صبح کے دروازے پر دستک

بھیگی شب کے سناٹے میں ایسا اس کا دھیان آتا ہے
جیسے کسی تالاب کے پانی پر دیتا ہو کنکر دستک

اب تک ذہن پہ منڈلاتی ہے دکھ سی میلی، شام سلونی
دل میں آس نراس کی الجھن، میں تنہا، اس کا در، دستک

ابھی تو امیدوں نے شیش محل میں رہنے کی سوچی تھی
ابھی سے کیوں دیتے ہیں در پر محرومی کے پتھر دستک

تن کا خالی برتن، چھن سے بج اٹھا۔ آزاد! جب اس نے
اس پر اک شب دی دی پہن کر اک خواہش کی جھانجھر دستک

—— تحریک (دہلی)

قمر اقبال

غزل غزل میں ستائش ترے جمال کی ہے
یہ دلکشی تری آنکھوں میں کس غزال کی ہے

اُتار دی ہے ہر اک پیڑ نے قبا اپنی
خزاں کی رُت میں ادا موسمِ وصال کی ہے

ہے دل کی ڈور میں بیتے ہوئے دنوں کا حساب
کہ ایک ایک گرہ ایک ایک سال کی ہے

مہک اٹھی وہ جگہ دو گھڑی جہاں بیٹھے
کہ سانس سانس میں خوشبو ترے خیال کی ہے

کہی نہ اس سے کبھی دل کی بات اس ڈر سے
ہر ایک بات پہ عادت اسے سوال کی ہے

خلا سے لوٹ کے آؤں گا پھر زمیں کی طرف
مرا عروج علامت مرے زوال کی ہے

(آہنگ دگیا)

عروج زیدی

کسے بتاؤں کہ غم کیا ہے، سرخوشی کیا ہے
ابھی زمانے کا معیارِ آگہی کیا ہے

قدم قدم پہ میں سنبھلا ہوں ٹھوکریں کھا کر
یہ ٹھوکروں نے بتایا غلط روی کیا ہے

زمیں پہ لالہ و گل، آسماں پہ ماہ و نجوم
نگاہِ حسن طلب کے لیے کمی کیا ہے

نظر نظر میں پیام و سلام کا عالم
کوئی سمجھ نہ سکا امرِ واقعی کیا ہے

پرائے نقشِ قدم پر قدم قدم چل کر
بتا رہے ہیں مجھے وہ کہ رہبری کیا ہے

نفس کی آمد و شد پر بھی اختیار نہیں
یہ زندگی ہے تو مقصودِ زندگی کیا ہے

وفا پرستوں سے کیوں ضد ہے، اس حبیب میں
سوال یہ ہے کہ اس کا جواب ہی کیا ہے

یہی قدم تھے محیطِ بساطِ کون و مکاں
قدم اٹھاؤں تو پھر دیکھنا ابھی کیا ہے

عروج تیرگیٔ شب کا احترام کرو
اسی سے تم نے یہ جانا کہ روشنی کیا ہے

——— تحریک (دہلی)

ارشد بجنوری

حیا اخفائے رازِ دل کی اک تدبیر ہوتی ہے
نظر جھکتی ہے وہ جس میں کوئی تحریر ہوتی ہے

روا کیا زحمتِ اظہار دی جاتی ہے ہونٹوں کو
محبت میں خموشی ورنہ خود تقریر ہوتی ہے

ہر اک دیوانہ پابندِ وفا رہتا ہے آخر تک
جنوں کے پاؤں میں بھی ہوش کی زنجیر ہوتی ہے

سبھی کرتے ہیں دعویٰ صاحبِ ایماں ہونے کا
مگر ہر دل کے آئینے میں اک تصویر ہوتی ہے

جہاں برقِ تپاں کی یورشِ پیہم کا امکاں ہو
عموماً آشیانے کی وہیں تعمیر ہوتی ہے

نہ جانے کون سے خوش بخت کا یہ قول ہے ارشد
کہ آہِ صبح گاہی میں بڑی تاثیر ہوتی ہے

——— تحریک (دہلی)

غلام مرتضیٰ راہی

بات بڑھتی گئی آگے مری نادانی سے
کتنا ارزاں ہوا میں اپنی فراوانی سے

ایسا ناپید ہوا میں سرِ منظر کہ نہ پوچھ
گرد بھی میری نہ پا لی گئی آسانی سے

بے تحاشہ جیسے ہم لوگ، ہمیں ہوش نہیں
وقت آرام سے گزرا کہ پریشانی سے

مجھ کو محسوس نہ ہوتا جو میں پتھر ہوتا
آئنے دیکھا ہی کرتے مجھے حیرانی سے

اب مرے گرد ٹھہرتا ہی نہیں کوئی حصار
بندشیں ہار گئیں بے سروسامانی سے

خاک ہی خاک نظر آئی مجھے چاروں طرف
جل گئے چاند ستارے مری تابانی سے

——— سطور (دہلی)

میں روز ایک نئی داستاں بناؤں گا
پھر اُس کے بعد خموشی میں ڈوب جاؤں گا

سکوں ملے مجھے مٹّی کی کوکھ میں شاید
میں مرگیا تو کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا

وہ ڈور ہے تو مرے ہاتھ میں رہے گی صدا
پتنگ ہے تو ہَوا میں اُسے اڑاؤں گا

جُدا جُدا ہیں لکیریں سبھی کے ہاتھوں کی
ہجوم میں بھی اکیلا ہی خود کو پاؤں گا

اگر نصیب ہوئی مجھ کو ایک بھی نیکی
میں اپنے سارے گناہوں کو بھول جاؤں گا

ـــــــــ ہماری زبان دعلی گڑھ

چندر پرکاش شاد

دل سے اک آگ کی دیوار ابھرتی جائے
زینہ زینہ شبِ تنہائی اُترتی جائے

تم سے ملنے کا جو برسوں میں کبھی آئے خیال
ہر طرف فاصلوں کی ریت بکھرتی جائے

وقت کی چال کو ہم روکے رہیں کمرے میں
اور اُدھر رات اندھا دھند گزرتی جائے

تپتا صحرا ہے ہر اک شہر، اور اُمیدِ سکوں
ایک بدلی ہے جو اُوپر سے گزرتی جائے

میں تو اوقات کے پھیلاؤ میں بڑھتا جاؤں
اور جو اک شے مرے اندر ہے وہ مرتی جائے

جانے کیا بھوت چھپے بیٹھے ہیں اُس آنگن میں
رات جائے تو وہاں کانپتی ڈرتی جائے

وہ نظر پھول کھلاتی چلے پہلو پہلو
بن کے کانٹا سا دلوں میں بھی اترتی جائے

——— تحریک (دہلی)

اسلم آزاد

عجیب شخص ہے مجھ کو تو وہ دوا نہ لگے
پکارتا ہوں تو اُس کو مری صدا نہ لگے

گزر رہا ہے مرے سر سے جو ہوا کی طرح
کبھی کبھی تو وہی لمحہ اِک زمانہ لگے

گلی میں جب یہ ہر اک سمت سے چلے پتھر
مجھے وہ شخص کسی طرح بھی بُرا نہ لگے

مزاج اس نے بھی کیسا عجیب پایا ہے
ہزار چھیڑ کروں پر اُسے بُرا نہ لگے

اسی خیال سے شاید ہے بند وہ کھڑکی
ٹھٹھرتی شام کی اس کو کہیں ہوا نہ لگے

سنائیں کس کو یہاں آپ بیتی ہم اسلم
ہمیں تو اپنی ہی ہر بات خود فسانہ لگے

——— شب خون (الہ آباد)

احتشام اختر

ورق ورق یہ فسانہ بکھرنے والا تھا
بچا لیا مجھے اس نے میں مرنے والا تھا

شگفتہ پھول پریشاں ہُوا تو غم نہ کرو
کہ وہ تو یوں بھی ہوا میں بکھرنے والا تھا

میں اس کو دیکھ کے پھر کچھ نہ دیکھ پاؤں گا
یہ حادثہ بھی مجھی پر گزرنے والا تھا

صدائے سنگ نے مجھ کو بچا لیا ورنہ
میں اس پہاڑ سے ٹکرا کے مرنے والا تھا

میں بے قصور ہوں یہ فیصلہ ہُوا ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

پہاڑ سینہ سپر ہو گیا تھا میرے لیے
وگرنہ مجھ میں سمندر اترنے والا تھا

——— موجِ رنگ، گیا

زیب غوری

دھڑکتے دل کو پتھروں میں ڈھونڈنا تو چاہیئے
کہیں خدا ملے، نہیں کوئی خدا تو چاہیئے

نہیں کہ اپنے دوستوں سے کچھ اُمید ہو مجھے
مگر کسی کو میرا حال پوچھنا تو چاہیئے

کسی سے رسمِ نامہ و پیام بند ہی سہی
مگر کبھی صبا کو ٹوکنا تو چاہیئے

کسی کو جیسے اب کسی کا انتظار ہی نہیں
کنارِ رہگذر کہیں کوئی دیا تو چاہیئے

کبھی تو میں بھی لطف و کیفِ گفتگو اٹھا سکوں
کبھی خموش بام و در کو بولنا تو چاہیئے

کہو تو اُٹھ کے کھڑکیوں کے اُودے پردے کھول دوں
اس آسمان پر کہیں کوئی گھٹا تو چاہیئے

ذرا رکو، کوئی بگولہ اٹھ کے رقص تو کرے
ہم اہلِ دشت کے لیے بھی رہنما تو چاہیئے

نہ جانے زیب میکدے سے جلد کیوں چلا گیا
کٹے گی کیسے رات کوئی آشنا تو چاہیئے

——— آہنگ (گیا)

عقیل شاداب

نہ زندگی سے شکایت نہ تم سے شکوہ ہے
مرا لباس ہی میرے لہو کا پیاسا ہے
بدن کو چھوڑ کے جاؤں تو اب کہاں جاؤں
جنم جنم سے مرا اس کے ساتھ رشتا ہے
مرا وجود مری اپنی ہی ننگا ہوں میں!
لباسِ جسم کے ہوتے ہوئے بھی ننگا ہے
صلیب لاؤ! اسے سرخرو کیا جائے
کوئی کتاب لیے آسماں سے اترا ہے
تمہارے جسم میں میں ہوں مرے وجود میں تم
ہر ایک آدمی اک دوسرے میں زندہ ہے
تم اپنے آپ سے کیوں اجنبی سے لگتے ہو
تمہارے جسم پہ شاداب کس کا پہرہ ہے

——— تحریک (دہلی)

حسن کمال

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا

پاگل کوئی اِک اِک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا، بتاؤ کدھر گیا

سورج کو جنم دے کے جھلنے کے واسطے
ٹھنڈی سی ریت چھوڑ سمندر اُتر گیا

سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمہیں
تم آئے تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا

جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آگئی سمجھ میں، تو بے موت مر گیا

ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسن
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

______ شاعر (بمبئی)

عبدالرحیم نشتر

پھول سا جسم نہ رستے میں جلایا کیجے
میں صنوبر ہوں مری چھاؤں میں آیا کیجے

اور کیا چاہیئے اس دور کے انسانوں کو
صرف دو چار گھڑی ساتھ بتایا کیجے

آپ ساگر ہیں تو سیراب کریں پیاسے کو
آپ بادل ہیں تو مجھ دشت پہ سایا کیجے

آپ سے نور کی خیرات طلب کرتے ہیں
بن کے خورشید نہ پھولوں کو جلایا کیجے

کم سے کم دیکھ سکوں اپنی حقیقت کیا ہے
میری آنکھوں سے نہ آئینہ چھپایا کیجے

——— آج کل (دہلی)

شاھد ماھلی

ہر مرحلے سے یوں تو گزر جائے گی یہ شام
لے کر بلائے درد کدھر جائے گی یہ شام

پھیلیں گی چار سمت سنہری اُداسیاں
ٹکرا کے کوہِ شب سے بکھر جائے گی یہ شام

رگ رگ میں پھیل جائے گا تنہائیوں کا زہر
چپکے سے میرے دل میں اتر جائے گی یہ شام

خونی بہت ہیں مملکتِ شب کی سرحدیں
ہاتھوں میں لے کے کاسۂ سر جائے گی یہ شام

ٹھہرے گی اک لمحے کو یہ گردشِ حیات
تھم جائے گی یہ صبح، ٹھہر جائے گی یہ شام

مہکے گا لفظ و معنی سے شاہد دیارِ صبح
لے کر مری غزل کا اثر جائے گی یہ شام

———— شاعر (بمبئی)

احمد وصی

خود کو چھونے سے ڈرا کرتے ہیں
ہم، جو نیندوں میں چلا کرتے ہیں
اپنی ہی ذات کے صحرا میں آج
لوگ چپ چاپ جلا کرتے ہیں
خون شریانوں میں لہراتا ہے
خواب آنکھوں میں ہنسا کرتے ہیں
ہم جہاں بستے ہیں، اس بستی میں
اب فقط سانپ ملا کرتے ہیں
آتی جاتی ہیں بہت سی یادیں!
دائرے بن کے مٹا کرتے ہیں